# حسن یار

کہانی وہاں سے شروع ہوئی تھی جب میں نے اخبار میں وہ اشتہار پڑھا تھا۔

اور کہانی میں ٹوئسٹ تب آیا جب میں نے اخبار میں وہ اشتہار دیا۔

ان دونوں اشتہاروں نے دوبار مجھے اشتہاری ـــــ میرا مطلب ہے بناڈالا ـــــ یعنی لائف بنادی۔

آپ کہتے ہوں گے بندہ ایک اور لائف دو دو ایک

## ناولٹ

انسان ایک ہی زندگی جیتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے بعض انسان ایک زندگی میں دو دو بار جیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس پہلے اشتہار کے بعد میں واقعی جیسے جی اٹھا تھا (یہ الگ بات کہ اس جی اٹھنے کے بعد میرے منہ سے علاوہ جی جی کے کچھ اور نکلتا ہی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"قیصر ـــــ" پھپھو کی آواز نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

ق سے قانون ق سے قاری صاحب ق سے قبضہ ق سے قینچی ق سے قابو۔

یعنی ق سے شروع ہونے والے زیادہ تر لفظ پر تشدد اور دل دہلانے والے ہی ہیں۔ لیکن میرا نام قیصر اس لیے مجھے نہیں دہلاتا تھا کہ یہ ق سے شروع ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ نام زیادہ تر پھپھو کے منہ سے ادا ہوتا ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ انہیں میرا نام بہت پسند ہے یا مجھ سے وہ بہت پیار کرتی ہیں اس لیے میرا نام چپٹی رہتی ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ فی الحال وہی میرا اس دنیا میں اکلوتا رشتہ ہیں ـــــ اور کس کو پڑی ہے جو وہ مجھ بیچارے کا نام لے۔

میں قیصر محمود عمر چھبیس سال (آج سے چار سال پہلے کی بات کر رہا ہوں ورنہ خواتین کی طرح عمر کم بتانے کا شوق نہیں ہے مجھے۔)

والد محمود علی مرحوم والدہ رابعہ علی مرحومہ ـــــ بھائی جان خورشید علی مرحوم ـــــ میری زندگی میں مرحومین کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ پتہ نہیں وہ لوگ اللہ کو زیادہ پیارے تھے یا میں انہیں کچھ کم پیارا تھا جو وہ ایک ایک کر کے مجھے چھوڑتے چلے گئے۔

ڈھائی سال کا تھا جب امی گئیں ـــــ چودہ سال کا تھا جب خورشید بھائی دوستوں کے ساتھ نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے اور سترہ سال کا تھا جب ابا جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ـ یہ میں محاورتاً" نہیں کہہ رہا ایسا واقعتاً" ہوا تھا۔ پھپھو نے ابا جی سے مہینے بھر کا خرچا مانگا تھا۔ جس کے جواب میں وہ ایک گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک پھوپھو نے خلاف عادت صبر سے جواب کا انتظار کیا۔ اس کے بعد بڑبڑاتے ہوئے ابا جی کا کاندھا ہلا کے اپنے جانب متوجہ کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ وہ ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے گزر چکے ہیں۔

نو سال ہو گئے ہیں میں مکمل طور پہ پھوپھو کے رحم و کرم پہ ہوں۔ پھوپھو نام کا عذاب ابا جی وصیت میں میرے نام کر گئے تھے اور وہ بھی جیتے جی ـــ امی کے جانے کے بعد پھپھو بھی گویا تیار بیٹھی تھیں یہ وہ ہونے کے لیے۔ ابا جی نے اپنا اور ان کا فائدہ دیکھا اور انہیں تین بچوں سمیت گھر لے آئے کہ ان کے بچے پل جائیں گے اور پھوپھو کو سر چھپانے کا ٹھکانہ مل جائے گا۔

انہوں نے صرف سر ہی نہیں چھپایا بلکہ ابا جی کی محنت کی کمائی کا ایک بڑا حصہ بھی چھپانے لگیں۔ میں چھوٹا تھا مگر سب دیکھتا اور سمجھتا تھا کہ کس طرح پھپھو دو کلو دودھ میں سے ڈیڑھ کلو اپنے اور اپنے بچوں کے لیے الگ کرنے کے بعد بقایا آدھ کلو میں پانی ملا کے اسے ہم دونوں بھائیوں اور ابا جی کے لیے ڈھک کے رکھ دیتی تھیں۔

کیسے بھنا گوشت ایک پیالی میں منتقل ہونے کے بعد ان کے کمرے میں چلا جاتا تھا اور دیگچی میں جگ بھر کے پانی انڈیلنے کے بعد آلو ہڈی کا شوربہ تیار ہوتا تھا۔ کیسے ہمارے لیے انڈے کی زردیوں سے ہمیشہ سائز سے دگنے کپڑے چھانٹنے کے بعد اچھی دکانوں سے ان کے تینوں بچوں کے کپڑے آتے۔

ابا جی مست ملنگ سے آدمی تھے۔ ان تمام باتوں سے بے نیاز۔ مگر میں کڑھتا رہتا تھا اور وقتاً" فوقتاً" اس کڑواہٹ کو اگل بھی دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے پھپھو مجھ سے خاصا خار کھاتی تھیں۔ جب موقع ملتا' میری دُھنائی کر کے رکھ دیتیں۔ خورشید بھائی مجھ سے تین سال بڑے تھے' وہ بیچارے میری ڈھال کیا بنتے وہ پھپھو سے مجھ سے کہیں زیادہ دبتے تھے پھر بھی ان کا دم غنیمت تھا' پھوپھو ان کے سامنے مجھے اور میرے سامنے ان کو زدوکوب کرنے سے گریز ہی کیا کرتیں اور کبھی اشد ضرورت پڑ بھی جاتی تو "ہتھ ہولا" رکھتیں کہ کہیں برادرانہ محبت امنڈ نہ آئے اور ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہنگامی طور پہ باغی نہ بن جائے اور جب خورشید بھائی بھی نہ رہے تو جیسے پھوپھو کو کھل کھیلنے اور من مانی کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

ابا جی جوان بیٹے کی اچانک وفات کے بعد اور بھی اپنے آپ میں سمٹ گئے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے' کیا نہیں ـــ میں ان کا اکلوتا بیٹا کس حال میں ہوں یہ جاننے کی انہیں چنداں فکر نہیں تھی۔

مکان کے اوپر والے حصے کا کرایہ کہاں جاتا ہے' نہ وہ یہ جاننے کی فکر کرتے ـــ نہ اس بات پر پریشان ہوتے کہ میں سترہ سال کا ہونے کے باوجود اب تک میٹرک میں کیوں پھنسا ہوا ہوں۔ جبکہ مجھ سے دو سال چھوٹا پھپھو کا منجھلا سپوت ـــ جو سپوت کم اور سنپولیا زیادہ لگتا تھا' وہ سیکنڈ ایئر میں تھا۔

پھوپھو کی سب سے چھوٹی بیٹی جو دراصل اکلوتی بیٹی بھی تھی' ساتویں میں پڑھتی تھی اگرچہ پڑھائی کے معاملے میں وہ کچھ کچھ مجھ پر پڑی تھی کہ تین سال ایک ہی کلاس میں لگا دیے تھے اس نے ـــ مگر اس کے اور میرے ایک ہی کلاس میں ڈٹے رہنے کی وجوہات قطعاً" مختلف تھیں۔ مجھے پڑھنے کا نہ وقت ملتا تھا نہ حالات سازگار تھے۔ سارا دن پھوپھو مختلف چھوٹے بڑے کاموں کے لیے دوڑائے رکھتیں۔

رات کو جان بخشتیں تو یا تو میں تھک کے پڑھنے کے قابل نہ رہتا یا پھر کسی نہ کسی وجہ سے دل اتنا بھرا ہوتا کہ آنسوؤں کی دھند کے سامنے کتاب کے حروف نظری نہ آتے جبکہ سویرا کو گھر پہ ٹیوٹر پڑھانے آتا تھا تب بھی

اس کا نتیجہ ہر سال خسارہ کی صورت میں نظر آتا۔

سورا ہے ہم سے دھوکا کھائیے گا اپنے ہم کے بالکل برعکس وہ ملتی شہم سے بھی زیادہ وحشت ناک شخصیت تھی اس کی۔ نہ گوری۔ نہ گندمی۔ نہ سانولی تھکین۔ بس عجیب خیالی "اوی اوی" رنگت تھی اس کی۔ کچھ زیادہ ہی "بڑی" آنکھیں طول و عرض پہ پھیلا "وسیع" دہانہ اور بے تواتر۔ لیکن دلربا سن لیتا تو ناک میں بولنے کے فن میں سورا کی مہارت کا قائل ہو کر اس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔

اس پہ بھی نخرے ایسے تھے کہ میرا نے ایڈیا سے آنے کے بعد بھی کیا کیے ہوں گے۔ اس کے نخروں کو برداشت دینے میں پھپھو پیش پیش تھیں۔

بھولا سجاد تو موقع ملتے پہ میری دھنائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کھونے دلی بھی پھوپھی تھیں۔ ان ہی کی شہہ پا کے مجھ سے بات بے بات خرخیاں نکالا کرتا تھا۔ اس لیے کہ ابا کے رہنے میں ہی میں اپنی مالیت بڑھا لیتا تھا۔ ورنہ کم رہتا دبکے ہوئے چوزے کی طرح پھوپھو کے پروں تلے رہتا۔ شکر ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے وہ ہر سورا ہے اور مجھے پھوپھو کی نظر بچا کے ادھر ادھر ہو جانے یا نافرمانی کرنے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔

سب سے چھوٹا دلاسفیر میرا ہم عمر تھا۔ وہ قدرے انسان تھا۔ اس کے ہاتھ کاہو میں رہتے تھے مگر زبان۔ تو یہ ایک نمبر کا جھوٹا اور خود غرض انسان تھا۔ سجاد کی زیادتی پہ بڑا سب کے سامنے مجھ سے ہمدردی جتاتا۔ کبھی کبھار تنہائی کے سامنے ڈٹ جاتا اور انصاف کے ہاتھ بڑھنے لگتا لیکن جب موقع ملتا مجھے قربانی کا بکرا بنانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

اپنی ہر غلطی پہ جھوٹ بولتے ہوئے ہر اس شخص کے کپڑے بھگویا کرتا جو اسے قریب نظر آتا۔ اور میری قسمت کہ بیشتر میں ہی اسے اصلی سے دستیاب ہوتا۔ بعد میں میرے شکوے کے جواب میں وہ مکاری سے مسکراتے ہوئے کہتا۔

"اپنے ہی بڑے وقت میں اپنوں کے کام آتے ہیں

یارے۔"

میں اب تک کچھ نہ کچھ توڑ پھوڑ مچا کر سورا کی غیبت مجھے زیادہ کھلی تھی یا غیبی امداد نے زیادہ آنسو رلایا تھا مجھے۔

میں بتا نہیں سکتا کہ وہ شش کر کے بھی ہوتی کے دھوے کرتا اور نزدیک ہونے پہ کیسے سب کر کے اسے کیا تھا۔ پیچھے سے لگ بھگ ہر بار ملتی مجھ سے بھدی ہنسی ہنستے۔ بس ایک موقع ایسا آیا تھا جب مجھے اس کام شیطت محسوس ہوا تھا وہ وقت تھا میرے یتیم ہونے کا۔ ابا کی وفات پہ ایک اسی کا کاندھا تھا جس پہ سر رکھ کے میں نے زندگی بھر کے آنسو بہا لیے تھے۔ اس کے بعد میرے دل میں جو بھی بار بھی ہلکا ہو کر آنکھیں سوا ہو گئی ہیں۔

○ ○ ○

"خصوصیات شو۔"

سورا تو اپنے میں سے ہے حسرت آنچل لیے ہی میرا حصہ لوٹ بھی لے گیا۔ میوں کر کے ڈنگ مار کے وہ اور قل میکاپ میں وہ سے زیادہ ہی گھسے ہی "کہاں جا رہے ہو" ہاں جی حاضر ہونے کے سوال کا جواب میں نے بھی مقدور بھر ناک چڑھا کے دیا۔

"کہیں بھی تمہیں بتانے کی ضرورت ہے؟"

ہاتھ بھر کی تو تھی وہ۔ چار انچ۔ اس سے میں کہیں بڑا۔ وہ زیادہ سے زیادہ چھ کے پھپھو کو میری شکایت لگا سکتی تھی۔ بچوں کی طرح کریان پکڑ کے لٹکنے تو نہیں دے سکتی تھی اور میں پھوپھو سے اب ان کے ہاتھ کی مار کھانے سے ان میں اتنی ہمت ہی تھی کہ وہ میرے پیچھے چل اٹھا کے بھاگ سکتیں۔ میں ایسا وہ رہا تھا کہ ان کی دھلائی کر سکے میں آنا فانا ان کا اس اب اسی حد تک چڑا تھا کہ وہ بھاگ مجھے کوسنے لگی وہ جاتی رہتیں وہ میرا گھاٹا کر دیتیں۔ اب جو مگر جیب تو میری ہر وقت خالی رہتی تھی وہ وقت کے

کھانے کے لیے میں پھوپھو کا ہی محتاج تھا اس لیے یہاں ذرا مات کھا جاتا اور ان کے کاموں میں گھن چکر بنا رہتا۔

"بڑی زبان کھلتی جا رہی ہے تمہاری؟ بتاؤں سجاد بھائی جان کو؟" اس نے تڑی لگائی چاہی۔

"اور میں بتاؤں تمہارے سجاد بھائی جان کو؟" میں نے ایسے ہی کہا۔

"کیا؟" اس کا رنگ اڑا تو میں کھٹک گیا۔

"وہی ـــ" چسکے لے لے کر کہتا میں ہوا میں تیر چلا رہا تھا۔

"بکواس ـــ نہیں کرو۔" رنگ تو جو اڑا 'سو اڑا اب زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"سواد آ گیا بادشاہو۔" اس کی ایک ایسی کمزوری ہاتھ آ جانے پہ میں خوشی سے جھوم گیا' جس کے بارے میں میں ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ بات ہے کیا۔

بڑا مسرور سا ہو کر میں دوبارہ باہر کی جانب بڑھا کہ اس کی آواز تیور بدل کے مجھ تک پہنچی۔

"سنو ـــ یہ ذرا کچھ چیزیں لا دو۔"

اس کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ اور ایک لسٹ تھی ۔میں نے وہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"دو بوتلیں' ایک پیکٹ نمکو' ایک چپس' بسکٹ' جھٹکا مت کھائیے' دس سال پہلے کھینچ تان کے ہی سہی مگر پچاس روپے میں یہ سب آ ہی جاتا تھا۔

"ٹیوشن والے سر آ رہے ہیں' جلدی لانا۔"

"یہ سر تمہیں پڑھانے آتے ہیں یا پکنک منانے؟"

"تمہیں کیا؟ ـــ جو کہا ہے وہ کرو۔" اس کے پنجے پھر تیز ہوئے۔

"آرام سے ـــ تمیز سے۔" میں نے گھور کے دیکھا۔ "ورنہ۔" دانستہ میں نے بات ادھوری چھوڑی ـــ کیونکہ اس سے آگے کہنے کے لیے میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

"پلیز ـــ" زندگی میں پہلی بار میں نے اس کے منہ سے یہ لفظ سنا۔

"اچھا ـــ ٹھیک ہے مگر زیادہ پھیلو مت۔" اس پہ احسان جتاتے ہوئے میں نے نصیحت بھی جھاڑی۔

"جانے میں رہو تو اچھا ہے۔ میں نہ سہی' کوئی اور بتا دے گا تمہارے بھائی کی جان کو۔ ایسے کام کرو ہی ناں جن پہ بعد میں ڈرنا پڑے۔"

اگرچہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کس وجہ سے بلیک میل ہو رہی ہے لیکن اتنا اندازہ تھا کہ ضرور کوئی ایسا غلط کام کر رہی ہے جس کو وہ ماں اور بھائیوں کے علم میں نہیں لانا چاہتی۔

"میں نے اس کی عمر کا حساب لگایا۔ بے شک آٹھویں میں پڑھتی تھی مگر عمر تو سولہ سترہ سال ہو رہی تھی۔ یعنی کسی لڑکے کا چکر بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی محلے کا یا شاید کسی سہیلی کا بھائی ـــ میں اندازے لگاتا اس کا مطلوبہ سامان لے کر آ گیا۔ اس کے بعد کافی دن تک میں نے اس رعایت کے مزے لوٹے۔ بس ایک معنی خیز ـــ دھمکی سے بھرپور نظر اس پہ ڈالنے کی دیر ہوتی اور وہ دب جاتی۔

"یہ کپڑے اوپر سوکھنے کے لیے ڈال آؤ۔" پھپھو دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی مجھے تھماتیں اور میں سویرا کو آرڈر دے دیتا۔

"سجاد کی یہ شرٹ استری کر کے اس کی الماری میں ہینگ کر دینا۔" سجاد شرٹ میرے منہ پہ مار کے جاتا اور میں سویرا کے ـــ

وہ تلملاتے ہوئے میرے احکام کی تعمیل کرتی رہتی ـــ میں اسی میں مسرور تھا۔ تفصیل میں جانے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ہوش تب آیا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

اس صبح پھپھو کے واویلا مچانے اور رونے دھونے پہ میری آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ بی بی سویرا بمعہ اپنے لیے بنا کے رکھے زیورات اور ماں کے جوڑے چالیس ہزار روپوں سمیت گھر سے غائب ہے۔

سجاد بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح ننھنے پھلائے

دیواروں سے ٹکریں مارتا پھر رہا تھا' پھپھو تو از دبا کے روتے ہوئے سینہ پیٹ رہی تھیں لیکن مجھے ان دونوں کی اس حالت کو دیکھ کر خاص لطف نہیں آرہا تھا ۔جو بھی تھا ۔۔۔ سویرا جیسی بھی تھی ۔۔۔ میرے ساتھ اس کا یا اس کی ماں اور بھائی کا رویہ جیسا بھی رہا ہو' بہرحال وہ میرے خاندان کی لڑکی تھی ۔۔۔ میں ان کے گھر میں نہیں وہ میرے گھر میں رہتے تھے ۔ یہ گھر میرے ابا جی کا تھا ۔ محلے میں اب بھی اس گھر کو محمود علی مرحوم کا گھر کہا جاتا تھا ۔ یہ بدنامی اب محمود علی مرحوم کی بدنامی کہلائی جانے والی تھی ۔

"چھوڑوں گا نہیں اس سر کے بچے کو ۔" سجاد کے گالیاں دینے پہ میں بری طرح چونکا ۔

"سر ۔۔۔" میں نے زرد چہرہ لیے بیٹھے سفیر کو تکا ۔

"وہی خبیث تو ہے ۔" ضبط سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی ۔

"وہ ٹیوٹر ۔" میں بڑبڑایا ۔۔۔ مجھے اپنی کم عقلی پہ جی بھر کے غصہ آیا ۔ میں اسے جھوٹی تڑیاں لگا تا رہا اور کچھ نہ سمجھا ۔ وہ ہر بار ٹیوٹر کے آنے پہ سویرا کا کچھ کہتی التجا کرتی نظروں سے میری جانب دیکھنا جیسے راز کو راز رکھنے کی درخواست کر رہی ہو ۔ وہ اس کے آنے پہ تواضع کرنا ۔۔۔ میں واقعی نہ سمجھ سکا ۔۔۔ اور خود سے زیادہ غصہ مجھے پھپھو پہ آیا ۔ وہ ماں تھیں ۔۔۔ میں ایک ناتجربے کار لاابالی لڑکا ۔۔۔ مگر انہیں تو کھٹک جانا چاہیے تھا کہ یہ کون سی ٹیوشن ہے جو تین تین گھنٹے بند کمرے میں اکیلے ہی پڑھائی جاتی ہے ۔

"قبر سے بھی نکال لاؤں گا میں اسے ۔ وہ سمجھتا کیا ہے ۔ سجاد کی عزت اچھالنا اتنا آسان نہیں ؟ ۔۔۔ اس کی بیاہی بہنوں کو بھی طلاقیں دلوا کے گلی میں نہ رولا تو نام بدل دینا ۔" وہ دھاڑتا ہوا گھر سے نکلا ۔

"سجاد ۔۔۔ سجاد رک جا ۔ عقل سے کام لے ۔ بات پھیل جائے گی ۔ رک تو ۔"

پھپھو پیچھے لپکیں ۔۔۔ مگر وہ نکل چکا تھا پھر انہوں نے گم صم بیٹھے سفیر کو جھنجھوڑا ۔

"جا ۔۔۔ سجاد کے پیچھے جا ۔۔۔ کہیں وہ کچھ غلط نہ کر


بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ۔

☆ نئے بال اگاتا ہے ۔

☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ۔

☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ۔

☆ ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

سوہنی ہیئر آئل قیمت =/70 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/70 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں ۔

1 بوتل کے لئے ---------- =/90 روپے

2 بوتلوں کے لئے ---------- =/160 روپے

3 بوتلوں کے لئے ---------- =/240 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں ۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان پتوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی ۔

فون نمبر: 2735021

ڈالے۔"

"اس سے غلط کیا ہو گا جو سویرا نے کیا ہے۔" اس کے لہجے میں تپش ہی تپش تھی۔ پھر اس نے کاندھوں سے ماں کے ہاتھ ایک جھٹکے سے اتارے۔

"دوسروں کے لیے تو خیر آپ نے کیا اچھائی دکھائی تھی۔" اس نے اچٹتی سی نظر مجھ پہ ڈالتے ہوئے ماں سے کہا۔

"کم از کم اپنی اولاد کے لیے ہی سگی ہو جاتیں۔"

پھپھو زمین پہ بیٹھ کے رونے لگیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھ سے دیکھا نہیں گیا اور میں گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھ کر انہیں پانی پلانے لگا۔

☼ ☼ ☼

سجاد نے جو کہا' وہ کر دکھایا۔۔۔ قبر سے نکال کر تو نہیں' البتہ وہ انہیں ریلوے اسٹیشن سے ضرور پکڑ لایا۔ کوئٹہ جانے والی ٹرین' پھپھو کی خوش قسمتی یا سویرا کی بد قسمتی کی وجہ سے دو گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی اس لیے دونوں سجاد کے ہاتھ لگ گئے۔ اس کا ایک دوست ایس ایچ او کا بیٹا تھا اس لیے سویرا کا نام آئے بغیر۔۔۔ اور پریس تک خبر پہنچے بغیر اس نا ہنجار ٹیوٹر کو تو آسانی سے اندر کروایا گیا اور سویرا کا مٹیالا رنگ پھوپھو نے مار مار کر نیلوں نیل کر دیا۔

"بس کریں پھوپھو۔۔۔ مار دیں گی کیا اسے؟"

میری شامت آئی تھی جو میں بیچ بچاؤ کرنے آگیا۔ سویرا تازی تازی محبت کی ماری۔۔۔ جدائی کا غم لیے چوٹ کھائی ناگن کی طرح مجھ پہ پل پڑی۔

"مرجا اللہ کرے۔۔۔ تجھے کیڑے کھائیں۔۔۔ تو نے ہی بکا ہو گا سر جی کا نام ورنہ کسی کو پتہ نہ چلتا۔۔۔ گھنا' میسنا' پہلے مجھے بلیک میل کرتا رہا پھر اپنی آئی پہ آ کے رہا۔۔۔ ذلیل کمینے۔۔۔ منہ سے بکتا تو سہی کہ تجھے کیا چاہیے تھا۔ میں دے دیتی اور تیرا منہ کچھ دن اور بند رہنے دیتی لیکن تو۔"

پھوپھو آنکھیں پھاڑے کبھی مجھے تو کبھی گالیاں اور کوسنے دیتی سویرا کو دیکھنے لگیں۔

"تمہیں' تمہیں پتہ تھا قیصر؟" کچھ دیر کی کوشش کے بعد انہوں نے پھنسی پھنسی آواز میں بے یقین سے لہجے میں پوچھا۔

"نمک حرام۔۔۔ احسان فراموش۔۔۔ یہ صلہ دیا ہے میری قربانیوں کا۔" اس کے بعد پھپھو کی چپل تھی اور میں۔۔۔

"قربانیاں۔۔۔" میں کمر سہلاتا۔۔۔ دوسرے ہاتھ سے اپنی کھوپڑی پہ چپل کے وار کا بچاؤ کرتا ان قربانیوں کے بارے میں اپنی یادداشت کھنگال رہا تھا۔

"کیسی قربانیاں؟۔۔۔ کبھی بقر عید پہ تو قربانی کی نہیں اور کون سی قربانی۔۔۔ ہائے۔" بلبلاتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

"تجھے اس دن کے لیے پالا پوسا۔۔۔ اپنے بچوں کے منہ کا نوالہ تیرے منہ میں ڈالا۔"

"اپنے بچوں کے منہ کا نوالہ' کیا ضرورت تھی ایسی مہربانی کی پھوپھو! اپنے بچوں کے منہ میں ہی ڈال دیتیں وہ روکھا پھیکا باسی نوالہ۔۔۔ ہائے۔"

میں مار کھاتا' ہائے ہائے کرتا سارے حساب کتاب بھی کھولتا جا رہا تھا۔

"کیا چھرا گھونپا ہے بے فیض نے میری پیٹھ میں۔۔۔ میری عزت اچھال کے۔۔۔ بے غیرت انسان' تیری بھی بہن لگتی ہے وہ۔"

"ارے واہ۔۔۔ میں اچھل کے پھوپھو کی دسترس سے قدرے دور ہوا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے ہانپنے لگیں۔

"میری کہاں سے بہن ہونے لگی۔۔۔ جن کی بہن ہے۔۔۔ وہ سنبھالتے' میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے عزتیں سنبھالنے کا۔"

پھوپھو کی مہربانی سے سویرا کی پھیلائی یہ ڈس انفارمیشن جلد ہی سجاد اور سفیر تک بھی پہنچ گئی۔ سجاد تو مجھے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھنے میں ہی عافیت جانی۔

"باہر نکل احسان فراموش انسان۔"

وہ باہر دھاڑ رہا تھا اور میں ذہن پہ زور ڈال رہا تھا کہ

آخر ماں بیٹے کو کون سے ایسے احسان یاد آرہے ہیں جو مجھے یاد نہیں آرہے۔

"سفیر۔۔۔ بچاؤ۔"

باتھ روم کا دروازہ کھول کر سفیر تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا تو میں نے فریاد کی۔ جواب میں وہ ایک تیز نظر ڈال کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"سفیر۔" میں اسے پھوپھو اور سجاد کی طرح کھل کر احسان فراموش تو نہیں کہہ سکا مگر جتا ضرور دیا۔

"میں کتنی بار تمہارے کام آیا۔ تم مجھے اس مصیبت سے نہیں بچا سکتے۔ میں سجاد بھائی کے ہاتھ لگ گیا تو وہ حشر کردیں گے مجھے۔ مارتے مارتے ان کی سانس بھی تو نہیں پھولتی پھوپھو کی طرح۔"

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا قیصر!" وہ سنجیدہ تھا۔۔۔ اور اس کا لہجہ گلے سے بھرپور۔

"اگر تم سویرا کو بلیک میل کرتے رہنے کے بجائے گھر میں کسی کو آگاہ کردیتے تو یہ مصیبت نہ کھڑی ہوتی۔ ہم بروقت کوئی اقدام کر لیتے۔ کم از کم عزت سے کھیلنے کا موقع تو نہ ملتا اس گھٹیا انسان کو۔"

"لیکن سفیر۔۔۔" میں نے وضاحت کرنا چاہی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ امی اور سجاد بھائی کا رویہ تمہارے ساتھ کبھی بھی ٹھیک نہیں رہا۔۔۔ مانا تمہارے ساتھ اس گھر میں بہت ناانصافیاں ہوئی ہیں لیکن تم نے ان کا بدلہ بہت غلط انداز میں لیا ہے۔ ایک لڑکی کی زندگی برباد ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ سوچو' وہ اسٹیشن پہ پکڑی نہ جاتی تو؟ کبھی واپس نہ آتی۔ یا چند دن بعد واپس آتی تو ہم کیا منہ دکھاتے دنیا کو؟"

"لیکن یقین کرو سفیر! مجھے ان دونوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔۔۔ خدا کی قسم۔"

"تم جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتے ہو؟ آج پتہ چلا ہے۔"

اس نے استہزائیہ ہنکارا بھر کے گویا میری وضاحت کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔

"میں نے تو ایک آدھ بار یونہی تکا سا لگایا۔۔۔ یہ بلیک میلنگ والی بات سویرا ایسے ہی اڑا رہی ہے۔"

"وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟"

"اپنے آپ سے توجہ ہٹا کے میری جانب کروانے کے لیے۔" میں نے چڑ کے کہا۔

"میری گردن ہی پتلی ملتی ہے اس گھر میں سب کو۔ چاہے وہ تم ہو۔۔۔ چاہے تمہاری بہن۔ دیکھ لو۔ اب وہ مزے سے بیٹھی ہو گی اور تم تینوں کے تینوں مجھ پہ چڑھ دوڑے ہو۔"

سفیر کو سوچ میں پڑے دیکھ کے میں نے اس غلط فہمی کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

"یہ ہے ساری بات۔۔۔ میرے فرشتوں کو علم نہ تھا کہ پڑھائی کے بہانے وہ انسان سویرا کو اس قسم کی ٹیوشن دے رہا ہے۔ ورنہ یقین کرو میں کبھی یہ بات نہ چھپاتا۔ کم از کم تمہیں تو بتا ہی دیتا۔"

سفیر نے چند سیکنڈ تک مجھے گھورا۔۔۔ اس کے بعد کمرے سے نکل گیا۔ اس نے نجانے میرے بچ کو کس طرح اپنی ماں اور بھائی کے لیے قابل ہضم بنایا کہ میری گلو خلاصی ہو گئی۔۔۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی۔۔۔ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں جا رہے ہو قیصر بیٹا؟"

شہد میں ڈوبی یہ آواز پھوپھو پہ سوٹ کر رہی تھی نہ لفظ بیٹا۔ میں نے غور سے پہلے انہیں دیکھا۔۔۔ پھر اپنے آپ کو۔۔۔ دونوں وہی تھے' نہ وہ بدلی تھیں نہ میں۔۔۔ پھر لہجہ اور طرز تخاطب کیسے بدل گیا۔

"جی۔۔۔ کالج۔" ہکلاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"ناشتے کے بغیر؟" انہوں نے کمال معصومیت سے یوں سوال کیا جیسے آج کوئی غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہو۔

"جی۔۔۔ ابھی بنا دیتا ہوں۔" مرے مرے انداز میں کہتا میں کچن کی جانب بڑھا۔

"ارے' ناشتہ تو میں بنا چکی ہوں۔" مسکراتے

ہوئے وہ مسلسل اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھیں۔
"سب کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔"
"میرے لیے؟"
"ہاں تمہاری پسند کے فرنچ ٹوسٹ۔"
"لیکن مجھے تو فرنچ ٹوسٹ زہر لگتے ہیں۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور پھر میں بچاؤ کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کہیں بپھر کے پھوپھو کچھ دے ہی نہ ماریں۔
"تو پراٹھا کھالینا۔۔۔ قیمے کا بناؤں؟"
"قیمہ؟۔۔۔ میرا؟" مجھے لگا' سننے میں غلطی ہوئی ہے اور پھوپھو نے میرا قیمہ بنانے کی دھمکی دی ہے۔
"آؤ اندر آؤ۔" وہ میرا بازو دبوچ کے مجھے کچن لے گئیں۔
فریج کے نزدیک رکھی چھوٹی سی ٹیبل کے گرد دھری تین کرسیوں میں سے ایک پہ مجھے بٹھایا' جو آج سے پہلے ان کے تین ہونہاروں کے لیے مخصوص تھیں اور گرما گرم سرخ سرخ قیمے والے پراٹھے کے نقے ملائی والی دہی میں ڈبو ڈبو کے خود میرے منہ میں ڈالے۔
ہکا بکا ہونے کی وجہ سے میرا منہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا اس لیے کم از کم انہیں منہ کھولنے پہ اصرار نہ کرنا پڑا۔ بعد میں دودھ پتی کا فل سائز مگ۔۔۔
"لو۔۔۔ کچھ کھایا پیا کرو۔۔۔ پڑھتے ہو تمہیں تو اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔"
"پھوپھو!" میں نے گرم گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی۔ "میں پچھلے آٹھ دس سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔"
"میں اگلی پچھلی ساری کسریں نکال دوں گی۔" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولیں۔
"ساری عمر میں ان نالائقوں کے پیچھے بھاگتی رہی تمہیں نظر انداز کیا اور یہ میرے کس کام آئے۔ نہ بیٹی کسی کام کی نہ بیٹے ہمدرد۔ ان سے اچھے تو تم ہو۔ آج تمہاری قدر محسوس ہو رہی ہے مجھے۔"
"آج؟" میں سوچ میں پڑ گیا۔ "آج میں نے ایسا کیا کیا ہے پھوپھو؟۔۔۔ ہاں کل آپ کا دوپٹہ ضرور ڈائی کروا کے لایا تھا۔"
"میرا بچہ۔۔۔ کتنا بھولا' کتنا سادہ۔۔۔ کتنا سیدھا ہے۔" وہ چٹا چٹ میری بلائیں لینے لگیں۔
پھر یہ عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔
ابھی میں اس نئے نویلے لاڈ اور پیار کے مزے بھی نہ لوٹ پایا تھا۔۔۔ فی الحال حیرت کے پہلے مرحلے میں سے ہی ابھرنے کی سعی کر رہا تھا کہ پھوپھو نے تمہید باندھ کے مجھے الرٹ کر دیا۔
"تم سے اپنے دل کی بات نہ کروں تو کس سے کروں۔ تمہارے علاوہ اور کون ہے اس گھر میں میرا سچا ہمدرد۔۔۔ قسم سے اتنی پریشان تو میں تب بھی نہ تھی جب سجاد کے ابو گزرے تھے۔"
"جی' وہ تو مجھے پتہ ہے۔" میں نے متانت سے سر ہلایا۔ وہ قدرے چونکیں کسی طنز کا شائبہ میرے چہرے سے تلاشنے کے لیے گھوری ڈالی' جواب میں میں نے تھوبڑے کو اور بھی مسکین اور برخورداروں والا بنا لیا' جس پہ مطمئن ہوتے ہوئے وہ مزید کہنے لگیں۔
"سویرا نے جو کالک تھوپی ہے' سوچتی ہوں اس کے بعد کون اسے اپنائے گا۔۔۔ کہاں کروں گی میں اس کلموہی کی شادی۔"
"کسی کو پتہ نہیں چلا ہے پھوپھو!" میں نے اطمینان سے ان کا خاص الخاص میرے لیے بنایا حلوہ ٹھونستے ہوئے کہا۔
"جہاں مرضی کر دیں اس کلموہی۔۔۔ میرا مطلب ہے سویرا کی شادی۔"
"نہیں بیٹا! ایسے معاملوں کی بھنک تو پڑ ہی جاتی ہے اور وہ مردود۔۔۔ وہ سر اگر کل کلاں کو وہ پھر سے کہیں نکل آیا اور سویرا کی شادی شدہ زندگی میں دخل دینے لگا تو پھر؟"
"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے چمچہ بھر کے منہ میں ڈالتے ہوئے تائید کی۔
"آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔" میرے بیان پہ پھوپھو کے چہرے کے زاویے بگڑے۔

"واقعی ـــ یہ تو سوچنے والی بات ہے بھلا گھر سے بھاگنے والی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ کوئی بھی نہیں۔"

"کر بھی سکتا ہے۔" پھوپھو نے فوراً" کہا اور پھر کچھ ہچکچاتے، کچھ شرماتے ہوئے وضاحت کی۔

"کوئی ایسا ـــ جس کا دل ہیرا ہو ـــ ہمدرد ہو ـــ احسان فراموش اور نمک حرام نہ ہو۔"

میرے کان بھی کھڑے ہوئے اور رونگٹے بھی ـــ ایک سیکنڈ میں میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

میں نے حلوے کی پلیٹ سائیڈ پہ رکھی ـــ منہ میں جو باقیات تھیں، ان کی مٹھاس کو کڑواہٹ میں بدلتے محسوس کیا اور ایک کڑوا گھونٹ لے کر ہلکا سا کھنکارا۔

"پھوپھو! میری ناقص رائے کے مطابق آپ کو جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا چاہیے۔ بات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ سویرا پہ اس وقت عشق کا بھوت سوار ہے۔ آپ دل کے ہیرے یا شکل کے زرقون والے کو بھی لا کے اس کے سامنے کھڑا کر دیں گی تو اسے نہ جچے گا۔ وہ اس وقت اپنے اسی پھٹیچر سر کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔ میری مانیں تو اس کا دل رکھ لیں اور اپنی عزت۔ اسی ٹیوٹر سے شادی کر دیں سویرا کی۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا حالانکہ وہ چونٹیوں بھرا کباب وہ مردود ـــ پینتیس سال کا آدھا گنجا، جس نے نجانے میری بھولی بھالی، معصوم سی بچی کو کون سے تعویز گھول کر پلائے تھے جو وہ اس کی باتوں میں آگئی۔"

"وہ کیا پلائے گا، یہی معصوم، بھولی بھالی روز پیپسی میں نمکو گھول کر پلاتی تھی۔" میں سوچ کے رہ گیا۔

"وہ بجتا تو نہیں میری سویرا کے ساتھ لیکن میں نے سوچا چلو سویرا کی خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی ـــ دل آجائے گدھے پہ تو پیرا کیا چیز ہے۔ اسی کو داماد بنا کے صبر شکر کر لوں گی۔ کم از کم عزت تو رہ جائے گی لیکن سجاد کی جلد بازی اور گرم مزاجی نے معاملہ خراب کر دیا۔ اس نے چار دن تھانے میں بند کر کے اسے وہ پھینٹی لگوائی ہے کہ اب وہ سویرا کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ میں گئی تھی اس کے پاس ـــ مگر وہ پیچھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ کہتا ہے جس کا بھائی اتنا ہتھ چھٹ ہو اس سے شادی کر کے میں نے مرنا ہے کیا؟"

"یہ تو ہے پھوپھو! سجاد بھائی کو شاید ہی کوئی سالا بنانے کی غلطی کرے کوئی پاگل ہی ہو گا۔" میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں کچھ باور کرانا چاہا۔ وہ جز بز ہوئیں۔

"اب ایسا بھی خونخوار نہیں ہے۔ بہن کو بھگانے والے کا یہی حال کرنا تھا اس نے ـــ ہاں البتہ بہن کو بیاہنے والا تو اس کے لیے قابل احترام ہو گا۔ بہنوئی کی تو عزت کرے گا ہی ـــ تم دیکھنا ـــ ذرا شکایت نہ ہو گی تمہیں۔" وہ کھل کے سامنے آگئیں ـــ میں اچھل کے رہ گیا۔

"مگر پھوپھو ـــ"

"اگر مگر نہ کرو اب ـــ میرے بیٹے ہو تو بیٹا بن کے دکھاؤ۔" انہوں نے میرا گال ایسے لاڈ سے پکڑا جیسے میرے انکار کے بعد نوچ کے رکھ دیں گی۔

"میں نے ـــ میں نے سویرا کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔" وہی لولا لنگڑا بہانا جو کزن سے شادی سے بچنے کے لیے عموماً" کام آتا ہے۔

"یہ تو تمہاری شرافت ہے، دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔"

"میں ـــ میں کہاں اس کے قابل ـــ میرا مطلب ہے کہ کہاں وہ ـــ کہاں میں۔"

"کوئی بات نہیں ـــ زندگی، موت کا معاملہ ہو تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ تم تو پھر بھی ـــ" دانستہ وہ بات ادھوری چھوڑ گئیں۔

"سویرا کبھی نہیں مانے گی۔" ایک اور عذر جلدی سے تراشا۔ "نہ اس کا دل راضی ہو گا اور میں زبردستی کسی کو ـــ"

"ایسی کی تیسی اس کی مرضی کی۔" پھوپھو نے میری بات کاٹ کر دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"دکھا دی ہے میں نے اسے اس کے ـــ کی اصلیت ـــ دبک کر بیٹھ گئی ہے اب وہ ـــ جہاں میں کہوں گی

وہیں سر جھکا دے گی۔"

"یہ ـــــ یہ ظلم ہے پھوپھو!" میں کراہا۔

"یہ اس کی سزا ہے۔"

"میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ یہ مجھ پہ ظلم ہے۔ مجھے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ سبق آپ اسے سکھانا چاہتی ہیں یا مجھے۔"

"کیا مطلب؟" میرے ہمت کر لینے کے باوجود انہیں یقین نہ آیا کہ میں انکار کر رہا ہوں۔

"تم ـــــ کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ میں سویرا سے شادی نہیں کروں گا۔" دل کڑا کر کے میں نے کہہ دیا۔

"تمہاری اوقات ہے انکار کی۔" وہ اپنی اصل جون میں آ گئیں۔ "تم دو ٹکے کے انسان ـــــ ہمارے ٹکڑوں پہ پلنے والے ـــــ میری چاند سی بیٹی کے لیے تم انکار کرو گے؟ تم؟ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ احسان مانو جو سویرا جیسی لڑکی مل رہی ہے۔"

"پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لیجیے کہ میں آپ کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہوں۔ یہ گھر میرا ہے ـــــ اور جس اسٹور پہ سجاد بھائی بیٹھتے ہیں وہ بھی ابا جی کا ہے۔ ٹکڑوں پہ آپ پل رہے ہیں۔"

یہ ہمت شاید پچھلے دو دن سے ملتے ترمال کی وجہ سے آئی تھی۔ دیسی گھی میں ڈوبے پراٹھے، یخنی، حلوے اور پھل کام آ رہے تھے۔

میرے تڑی لگانے پر پھوپھو پراسرار طریقے سے مسکرائیں۔

"بچے، وہ گھر اور دکان سالوں پہلے سجاد کے نام بیچ چکے ہو تم۔"

"بیچ چکا ہوں؟ مگر کب؟ کیسے؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"کب کیسے والی بات جانے دو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا یہ کھیل۔ ہاں ثبوت کے طور پہ پکے کاغذ دکھا سکتی ہوں تمہیں۔ شاید تمہیں یاد آ جائے کہ تم نے ان پہ کب سائن کیے تھے۔ مگر ان سب کا کیا فائدہ ـــــ حاصل بحث تو یہ ہے کہ اب تم مکمل طور پہ ہمارے رحم و کرم پہ ہو۔ کہاں جاؤ گے ہم سے بگاڑ کر۔ داماد بن کے رہو اور مزے کرو۔"

"اب تو ہرگز نہیں۔ یہ جاننے کے بعد تو بالکل بھی نہیں کہ آپ لوگ صرف سنگدل اور مطلب پرست ہی نہیں، دھوکے باز اور جعلساز بھی ہیں۔"

میں نے اپنے دو چار سوٹ اٹھائے، بیگ میں ٹھونسے اور نکلنے لگا۔

"جا رہے ہو تو یہ سن لو کہ یہاں سے کوئی منانے نہیں آئے گا، ہاں دو مہینے دیتی ہوں، دو مہینے کے اندر اندر خود لوٹ آئے تو چپ چاپ بغیر کسی سوال جواب کے تمہارا نکاح سویرا سے پڑھا دوں گی ورنہ شکل بھی نہ دکھانا اپنی۔"

میں رکا ـــــ ایک زہر خند نظر ان پر ڈالی ـــــ ان کا چہرہ، آج سے پہلے مجھے کبھی اتنا مکروہ ـــــ اتنا بھیانک نہیں لگا تھا۔

"نہیں آؤں گا ـــــ کبھی بھی نہیں۔" میں اتنے یقین سے بولا کہ ان کی شیطانی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ـــــ شاید ان کی یہ خوش فہمی کمزور پڑنے لگی کہ میں کبھی ہار مان کے واپس لوٹوں گا۔

☆ ☆ ☆

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا ـــــ کبھی بھی نہیں۔"

اپنے واحد دوست کامران کی منت سماجت کرنے کے بعد مجھے بمشکل اس کے گھر چند دن سر چھپانے کی جگہ ملی تھی اور ابھی میں اس اسٹور نما کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سفیر آ گیا۔ وہ میرے اکلوتے دوست سے بھی واقف تھا اور اس کے ٹھکانے سے بھی۔ اسی لیے سیدھا وہیں چلا آیا اور میں نے بھی اسے دیکھتے ہی چلا کر اعلان کر دیا۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا ـــــ کبھی بھی نہیں۔"

"تمہیں لینے کون آیا ہے۔" سفیر نے منہ چڑایا۔

"یہ لو ـــــ پکڑو۔" اس نے ایک اخبار مجھے تھمایا۔

"پکڑ لیا ـــــ اب جاؤ۔"

"صرف پکڑو نہیں ـــــ پڑھو بھی۔"

"میرے گھر چھوڑنے کی خبر چھپ بھی گئی؟"

"الو..... اس میں چھپے ایک اشتہار کی وجہ سے آیا ہوں میں۔ اسے پڑھو اور اس کے بارے میں سوچو۔ کب تک دوست کے گھر پڑے رہو گے اور وہ بھی ایسے کمینے دوست کے گھر۔ جو گھر آئے مہمان کو ایک گلاس پانی پلانے کا روادار نہیں' ایک گھنٹے کا راستہ ہے ..... مر رہا ہوں پیاس سے۔"

"اشتہار....." میں نے زیر لب دہراتے ہوئے اخبار کھولا۔

جی ہاں..... آپ نے درست پہچانا..... یہ وہی اشتہار تھا' جس نے میری زندگی بنادی..... میں پھر سے جی اٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ضرورت ہے ایک گیٹ کیپر کی..... اسلحہ لائسنس ہونا لازمی ہے' عمر چالیس سے....."

"دفع....." میں نے اس پہ کٹ لگایا' دوسرے اشتہار پہ نظریں دوڑائیں..... وہ کسی ضرورت برائے خانساماں کا تھا۔

"لاحول ولا..... اچھا مذاق کیا ہے سفیر نے۔ اب میری یہی تو اوقات رہ گئی ہے کہ میں چوکیداری یا خانساماں گیری کروں۔"

چند ایک اور اشتہار بھی تھے لیکن وہ ان سے بھی زیادہ سنگین نوعیت کے مذاق تھے کیونکہ میری کوالیفکشن ان کے مطلوبہ معیار کے آس پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ میں نے فوراً" سفیر کا نمبر گھمایا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"خراب تو اب تمہارا ہو گا کیونکہ سنا ہے پیسہ اچھے اچھوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پیسے پہ..... مجھ سے نہیں ہو گا یہ۔"

"تو مرو پھر سڑکوں پہ..... مجھے کون سا شوق ہے تمہیں مجبور کرنے کا۔ یونہی پڑھا تو سوچا' تمہیں بتا دوں' تمہارا بھلا ہو جائے گا۔ کب تک دوست کے گھر پڑے رہو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..... کام کی تلاش مجھے بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں کچھ بھی کر لوں۔"

"کرنا پڑتا ہے دوست..... مجبوری میں سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔"

"ہاں..... مجبوری۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"شاید..... ٹھیک کہتے ہو تم..... مجھ سے زیادہ مجبور کون ہو گا۔"

"یعنی تم راضی ہو۔" وہ چہکا۔

"راضی..... ہونہہ زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا پڑے گا ورنہ تمہاری والدہ اور بھائی نے تو سڑک پہ لانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے طعنہ دے دیا۔

"اس طعنے بازی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے تم انٹرویو کی تیاری پکڑو۔ تمہارے جیسے نجانے کتنے پہنچے ہوں گے وہاں۔ مقابلہ سخت ہے پیارے۔"

"لیکن یار' میں چلا تو جاؤں..... ضروری تو نہیں کہ سلیکٹ بھی ہو جاؤں۔"

"کیوں' تم میں کس بات کی کمی ہے؟"

"عمر کی' تجربے کی اور ہاں لائسنس اور سرٹیفکیٹ کی بھی۔"

"کیا مطلب؟ کیسا لائسنس؟ کیسا سرٹیفکیٹ؟"

"اسلحے کا لائسنس۔"

"ابے....." وہ چیخا..... جیسے کسی نے اسے سوئی چبھو ڈالی۔

"اور ککنگ کے سرٹیفکیٹ..... وہ کہاں سے لاؤں گا۔ ٹھیک ہے پھوپھو اپنے ساتھ کچن میں لگائے رکھتی ہیں مگر سچ پوچھو تو اتنے سال ان کی مغزماری کے باوجود میں نے ککھ نہیں سیکھا۔ صرف آٹا گوندھنے' روٹی پکانے' انڈہ فرائی کرنے' بریڈ ٹوسٹ کرنے اور چائے بنانے پہ وہ مجھے خانساماں رکھنے سے تو رہے۔ اسی طرح گیٹ کیپر کے لیے نہ صرف لائسنس شدہ اسلحہ کا ہونا ضروری ہے بلکہ عمر بھی وہ چالیس سے پینتالیس سال مانگ رہے ہیں ساتھ دس سال کا تجربہ

بھی۔ چلو لائسنس میں کسی طرح بنوا بھی لوں تو عمر۔۔۔"
"چپ کر۔۔۔ اس نے چلا کر میری زبان کے آگے بریک لگائی۔" کیا بک بک کرتا جا رہا ہے۔ کون سے اشتہار پڑھ ڈالے ہیں تو نے الو۔۔۔ میں تجھے کچھ اور دکھا کے آیا تھا۔۔۔ نیچے والے اشتہار پہ نظر ڈال۔"
"وہ۔۔۔ نہیں یار! انہیں تو چاہیے ایم بی اے' بی بی اے' سی اے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ میری تو بی اے کی سند بھی بیچاری اور لنڈوری سی ہے۔"
"نالائق گدھے۔۔۔ سب سے نیچے ضرورت رشتہ کے کالم میں۔۔۔ جس اشتہار کے گرد میں نے دائرہ لگایا ہوا ہے وہ۔"
"کیا۔۔۔ رشتہ؟"
میں نے فون پھینکا اور نیچے گول مول کر کے پھینکے گئے اخبار کو اٹھا کر بے تابی سے پڑھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز میں درج شدہ پتے پہ دیے گئے وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ گیا۔
کامران کی منت کر کے اس کا بلیک سوٹ بھی لے کر پہن لیا۔۔۔ خوشبو چھڑکے' جیل سے بال جمائے' کھرچ کر شیو بنانے کے بعد میں خود کو خاصا معزز اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔
"تیار ہو۔۔۔ دیر نہ کر دینا۔" سفیر نے فون پہ کہا تھا۔
"بس نکل رہا ہوں۔"
"کہو تو میں آجاؤں۔۔۔ مورل سپورٹ کے لیے۔"
"جی نہیں' شکریہ۔" میں نے بھنا کے فون بند کر دیا تھا۔
وہ شاید میرا پتہ صاف کرنے کے لیے آنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بارے میں کوئی بھی حتمی اور یقینی رائے دینا خاصا مشکل کام ہے۔ ابھی وہ آپ کے کام آ رہا ہے اور ابھی آپ کا کام تمام کر رہا ہے۔
"تو ڈر تو نہیں رہا؟" ابھی میں نے کمرے سے پہلا قدم ہی باہر نکالا تھا کہ اس کا فون دوبارہ آگیا۔
"ابھی تو نہیں۔" میں نے سچ بتایا۔ "لیکن کیا پتہ اس کی شکل دیکھنے کے بعد لگے۔ ظاہر ہے' جو کروڑ پتی شخص اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے مجھ جیسے یتیم' لاوارث' بے گھر اور معمولی تعلیم یافتہ شخص کو پسند کر لے گا' اندازہ کرو کہ اس کی بیٹی کن صفات کی مالک ہو گی۔ لنگڑی' کانی' بہری' گونگی' ٹنڈی کچھ بھی ہو سکتی ہے۔"
"یہ بھی ہو سکتا ہے نقص اس کی شکل و صورت میں نہیں' عادتوں میں ہو' مزاج کی کانی ہو۔"
"نہیں نہیں۔" میں گھبرا گیا۔
"اللہ کی بنائی شکل و صورت میں کمی بیشی پہ میں صبر کر کے گزارا کر سکتا ہوں مگر کردار میں کمی ہرگز نہیں۔"
میں یہ تہیہ کر کے گیا تھا کہ اگر تو قسمت مہربان ہو گئی اور اس مجبور بے بس باپ نے مجھے بطور داماد پسند کر لیا تو میں ترسے ہوؤں کی طرح باچھیں پھیلا تا سرا باندھ کے نہیں بیٹھ جاؤں گا بلکہ آخری فیصلہ لڑکی سے ملنے کے بعد کروں گا' اسے اچھی طرح سے جانچنے پرکھنے کے بعد۔ اگر تو وہ کروڑ پتی اپنی نک چڑھی یا کسی حد تک آوارہ اور بھنور اصفت بیٹی کی ناک میں نکیل ڈالنے کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے تو میں صاف انکار کر دوں گا۔
شیخ چلی کی طرح منصوبے بناتے بناتے بالآخر میرا نمبر بھی آ ہی گیا۔ نائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔
"ہوں۔۔۔ تو قیصر محمود۔۔۔ کوائف تو تمہارے پڑھ لیے ہیں میں نے کچھ خود اپنے بارے میں بتاؤ؟"
"اس پچپن چھپن سالہ چھ فٹ کے صحت مند اور کرخت صورت شخص نے گمبھیر اور رعب دار آواز میں پوچھا جو میرے بالکل سامنے قیمتی گرے سوٹ میں ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔ بیش قیمت سگار ہونٹوں میں دبائے۔۔۔ وہ کریم بخش رندھاوا تھے۔
"جی میں۔۔۔" میں نے خشک ہوتا گلا تھوک نگل کر گیلا کرنا چاہا۔ سب کچھ ان کے ہاتھ میں تو تھا۔ اب خود سے کیا بتاتا۔
"سگریٹ پیتے ہو؟"

"جی بالکل نہیں۔"
"شراب؟"
"لاحول ولا۔۔۔"
"میڈیکل ریکارڈ کیسا ہے؟"
"جی بہت اچھا۔۔۔" اس سوال کا جواب میں نے فخریہ دیا۔
"ہیپاٹائیٹس، دمہ، شوگر وغیرہ؟"
"جی بالکل بھی نہیں۔" میں نے سینہ پھلایا۔
"تم نے کوئی میڈیکل رپورٹ منسلک نہیں کی اپنے کوائف کے ساتھ۔ اپنی وے میں کچھ ٹیسٹ لکھ کے دیتا ہوں۔ میری تسلی کے لیے وہ کروالو۔"
"جی۔۔۔ ٹیسٹ؟"
"کچھ بلڈ ٹیسٹ ہیں، گھبراؤ نہیں۔۔۔ وہ ٹیسٹ نہیں ہیں جن کے رزلٹ اور سرٹیفکیٹ اس وقت میرے ہاتھ میں ہیں۔"
انہوں نے میری میٹرک کی سند اور بی اے کی سند پہ ایک تحقیر آمیز نظر ڈالتے ہوئے انہیں کسی بے کار سی چیز کی طرح ٹیبل پہ پھینکا۔۔۔ جن پہ بڑا واضح سی گریڈ لکھا ہوا تھا۔
اس انٹرویو میں انہوں نے مجھ سمیت تین اور لڑکوں کو اگلے مرحلے کے لیے سلیکٹ کیا تھا اور وہ تینوں بھی میری طرح مکمل یتیم اور بے روزگار تھے۔ پتہ نہیں ان کا معیار کیا تھا۔۔۔ ہم چاروں ایک ہی لیب میں ٹیسٹ کروانے بھیجے گئے اور قسمت کی بات کہ میری تمام رپورٹس ان کے مقابلے میں کریم بخش صاحب کو کہیں زیادہ تسلی بخش لگیں۔
یعنی مجھے انہوں نے اپنا داماد۔۔۔ بلکہ گھر داماد بنانے کا عندیہ ظاہر کردیا۔
"زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اپنی جانب سے ساری تسلی کرلینا بیٹی کے باپ کا حق ہے۔ تمہیں ان بائیس لڑکوں میں ترجیح اس لیے نہیں ملی کہ تم کوئی تیس مار خان ہو۔ تم سے زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ خوش شکل اور زیادہ یتیم لڑکے آئے تھے۔"
تعلیم یافتہ اور خوش شکل زیادہ ہونے والی بات تو سمجھ میں آگئی مگر یتیم زیادہ ہونے والی اصطلاح سر سے گزر گئی۔
"یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ میڈیکلی تم ان سب سے زیادہ فٹ ہو۔ یعنی تمہاری واحد کوالی فیکیشن یہ ہے۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم اپنی اس اکلوتی صلاحیت اور قابلیت کو کب تک اور کس حد تک برقرار رکھتے ہو۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ اچھی بات ہے مگر کبھی پیو گے بھی نہیں۔ یہی پابندی دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ہے اور ذرا سی خوش حالی آجانے پہ ان رشتے داروں کے پاس جانے کو عموماً دل ہمکتا ہے جن سے دھتکارے گئے ہوں، یہ غلطی مت کرنا۔"
میں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔
"اس قسم کے مطلبی اور توتا چشم رشتے دار سوائے دل کی بیماریوں اور ہائی بلڈ پریشر کے کچھ نہیں دیتے۔"
"جی۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔"
میں ان کی شخصیت کے رعب میں یہ بات بالکل فراموش کر گیا کہ میں ان کی صاحبزادی کو دیکھنے، جانچنے، پرکھنے کا فیصلہ کرکے یہاں آیا تھا۔ یہ بات تب یاد آئی جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ چار دن۔۔۔ صرف چار دن کے اندر اندر انہوں نے شادی کی سب تیاری اور انتظامات مکمل کرلیے۔
ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تقریب تھی۔۔۔ نکاح اس سے پہلے اسی صبح گھر پہ ہونا تھا۔ میرا بڑا دل چاہا اس موقع پہ پھوپھو کو بلواؤں انہیں دکھاؤں کہ شہر کے چند نامی گرامی افراد میں سے ایک، کریم بخش رندھاوا، میرے سسر بننے جا رہے ہیں۔ جنہوں نے بڑے طمطراق سے مجھے کہا تھا۔
"شکر کرو، میں اپنی سویرا کی شادی تم سے کر رہی ہوں ورنہ تمہاری حیثیت کیا ہے، جو کوئی تمہیں اپنی بیٹی دے۔"
اب میں انہیں اپنی حیثیت دکھانے کو مچل مچل رہا تھا مگر ساتھ ساتھ رندھاوا صاحب کی وارننگ بھی یاد آ رہی تھی۔ جو انہوں نے واضح الفاظ میں دی تھی۔

واقعی خاصے زمانہ شناس اور تجربے کار شخص تھے۔ کیسے بھانپ لیا تھا انہوں نے کہ میں اس موقع پہ ان دھتکار دینے والے رشتے داروں کو ضرور یاد کروں گا۔ میں نے بڑی مشکل سے دل میں امنڈنے والی اس خواہش کو دبایا۔ میری جانب سے صرف کامران اور سفیر شریک ہوئے۔

"یار! بھابھی تو خاصی حسین ہیں۔"

کامران کی سرگوشی پہ میں نے پہلی بار دھیان دیا ورنہ اب تک تو نئے نئے ملنے والے اس پروٹوکول کے خمار میں ہی گم تھا۔

"حسین؟" میرے کان کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی سفیر کی پیش گوئی یاد آئی۔

"ہو سکتا ہے نقص اس کی شکل و صورت میں نہیں، مزاج اور عادتوں میں ہو۔"

میں نے بھی پنک اور موو کلر کے کنٹراسٹ کا قیمتی شرارہ پہنے اسٹیج پہ بیٹھی اپنی تین گھنٹے پرانی بیوی کو غور سے دیکھا۔

بوٹا سا قد..... دودھیا رنگت..... تراشے ہوئے نقوش..... غزالی آنکھیں۔

"یا اللہ! کہیں سفیر کی بات سچ نہ ہو جائے..... اتنی خوب صورت بیٹی کی شادی تب ہی کوئی اخباروں میں اشتہار دے کر مجھ جیسے لاوارث، بے روزگار سے کرتا ہے جب وہ سانپ کے گلے میں چھچھوندر ثابت ہو رہی ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے اس کے دلکش چہرے سے نظر ہٹا کے اس کے پیروں پہ ڈالی میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش پولیو سے اس کی ٹانگیں مریل اور پیر سوکھے ہوئے نظر آئیں۔ مگر دو گلابی گلابی سے نرم پیر سنہری سینڈل کے فیتوں میں قید نظر آئے..... میں نے صوفے کے آس پاس بیساکھی یا وہیل چیئر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں..... وہ بھی ناپید۔

"شاید گونگی یا بہری ہو۔" دل نے ایک اور سہارا تلاشنا چاہا اور اسی پل اس کی کسی دوست نے جو اس کے برابر ہی بیٹھی تھی؟ اس کے کان میں سرگوشی کی جسے سن کر وہ نہ صرف شرمائی..... مسکرائی بلکہ آہستہ سے جواب میں کچھ کہا بھی۔

"اب بس بھی کرو۔ پہلی بار ضرور دیکھ رہے ہو مگر آخری بار نہیں۔" کامران ہنستے ہوئے زہر لگ رہا تھا۔

"قیصر....." سفیر نے مجھے بعد میں تنہا پا کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دل سوزی سے کہا۔

"دیکھو..... سسرال کو اپنا گھر سمجھنا ہماری ناک نیچی نہ ہونے دینا۔ اب تمہارا جنازہ ہی اس گھر سے اٹھنا چاہیے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ یہ اب تمہاری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے۔ پہلا اور آخری موقع خود کو ثابت کرنے کا۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔"

اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے میری اوقات یاد دلادی۔ واقعی میں تو ایک گیٹ کیپر یا خانساماں کی نوکری حاصل کرنے کے اہل بھی نہیں تھا۔

میں نے ایک حسرت بھری نظر اس کے دلہنا پے سے سجے روپ پہ ڈالی اور سرد آہ بھر کے سر جھکا لیا۔ نجانے اس حسین و دلکش چہرے کے پیچھے سے میرے لیے کیا برآمد ہونے والا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے حجلۂ عروسی میں قدم رکھا..... بہت سی فلموں اور ڈراموں میں دیکھے سین یاد آ رہے تھے جن میں ایسی خوب صورت امیر زادیاں اپنے باپ کے زر خرید دامادوں کے منہ پہ سگریٹ کے کش لگا کے دھواں چھوڑتی ہوئی انہیں عمر بھر نظر اور گردن نیچی رکھنے کی تلقین یاد دھمکی دیتی نظر آتی تھیں۔

"یا اللہ! عزت رکھنا..... اسے اتنا ہی خطرناک ظاہر کرنا جتنا میں برداشت کر سکوں، ویسے بھی تو کسی کو اس کی برداشت زیادہ آزماتا نہیں ہے۔"

رقت بھرے انداز میں دعائیں مانگتا میں اس کے قریب گیا۔ خلاف امید وہ بڑی شرافت سے گھونگھٹ گرائے بیٹھی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گھونگھٹ اٹھانے کی جسارت کی..... ایک اور توقع پہ پانی پھر گیا۔ وہ گھونگھٹ کے اندر چھپی سوٹے نہیں لگا رہی تھی بلکہ

شرمیلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔
"وہ۔۔۔" میں نے اسے پکارنا چاہا اور اچانک میری سٹی گم ہو گئی۔ حیرت انگیز طور پہ اس کا نام میرے حافظے سے دوڑ لگا چکا تھا۔
"کیا مصیبت ہے۔۔۔ کیا نام تھا اس کا روبینہ ثناء۔۔۔ مونا' حنا۔" میں ایک ایک کر کے کئی نام ذہن میں گنوانے لگا مگر کسی نام پہ ذہن میں جھماکا نہ ہوا۔
"اوہو۔۔۔ کون سا نام لیا تھا مولوی صاحب نے نکاح پڑھاتے ہوئے۔۔۔ آنسہ' آنسہ' آنسہ۔"
میں دہرانے لگا مگر آنسہ کے آگے کچھ یاد ہی نہ آ رہا تھا۔ میں چپکے سے اٹھا۔۔۔ الماری کی جانب بڑھا جس کے دراز میں صبح ہی میں نے نکاح نامہ رکھا تھا۔ دراز کھولتے ہوئے میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ سر اٹھائے بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں حیرت سموئے مجھے تک رہی تھی۔ اس سے نظر چراتے ہوئے الماری کے پٹ کی آڑ لے کر میں نے نکاح نامہ کھول کے اس پہ جلدی جلدی نظریں دوڑائیں۔
"آنسہ ہنزہ کریم۔۔۔ ولد کریم بخش رندھاوا۔"
ایک سکون بھرا سانس لیتے ہوئے میں الماری بند کر کے پلٹا۔ نام بھول جانے کی پاداش میں یہ نک چڑھی نخریلی امیرزادی نجانے میرا کیا حشر کر ڈالتی۔۔۔
"ہنزہ۔۔۔" میں نے لہجے میں ادب اور محبت کا مکسچر گھولتے ہوئے پکارا مگر عجیب گھگھیائی ہوئی سی غراہٹ نکلی۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" بڑی ہی مدھر آواز میں اس نے پوچھا۔
"طبیعت۔۔۔ ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔" میں صورت اور آواز کا ایسا حسین سنگم دیکھ کے ہی بوکھلا گیا۔
"پانی پیجئے۔" چہرے پہ گھبراہٹ کے تاثرات لیے وہ بیڈ سے اتری' چوڑیوں' پازیب اور جھانجھروں کی سرگم نے میرے دل کی دھڑکن کو ایک الگ ہی تال دے ڈالی۔۔۔ ایک بوجھ سا روح سے ہٹتا محسوس ہوا۔
"پانی۔۔۔" حنائی ہاتھوں میں پانی کا گلاس لیے وہ میرے سامنے تھی۔
"آپ۔۔۔ آپ اکبل رندھاوا کی بیٹی ہیں؟" بڑے ہی ہونق پن کے ساتھ میں نے پوچھا۔
وہ ہنس پڑی اور آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
"کیا یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوئی ہے؟" میرے اس دوسرے سوال کا جواب بھی اس نے اسی پہلے والے انداز میں دیا۔
"پورے ہوش و حواس میں؟"
اس بار وہ شرمانے اور مسکرانے والی روایت کی ہیٹ ٹرک نہ کر پائی اور پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔
"آپ کی طبیعت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔"

☆ ☆ ☆

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اس انکشاف کے بعد میں جی کیسے اٹھا تھا۔
ہنزہ جیسی بیوی واقعی عطیۂ خداوندی تھی۔ اس میں وہ سب تھا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اتنی خوبیاں کہ روز دو جنم بھر سامنے آتیں اور میں خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا۔
وہ جتنی خوب صورت تھی' اس سے بڑھ کر خوب سیرت اور جس طرح گلاب کے ساتھ بے شمار کانٹے ہوتے ہیں اسی طرح میرے اس گلاب کے ساتھ ایک بڑا سا کانٹا تھا۔
کریم بخش رندھاوا۔۔۔ میرے سسر۔۔۔

☆ ☆ ☆

جتنے خدشات مجھے ہنزہ کے حوالے سے تھے۔ وہ سارے کے سارے مجسم ہو کر سامنے آئے مگر کریم بخش رندھاوا کی ذات سے منسلک ہو کر۔
شروع شروع میں تو وہ میرے لیے ایک پہیلی کی مانند رہے نہ میں ان کی طبیعت کو سمجھ پایا نہ مزاج کو۔۔۔ نہ اس بات کو کہ اپنی ہمہ صفت اور ہیرا سی بیٹی کے لیے جب ایک سے ایک عمدہ رشتہ مل سکتا تھا تو انہوں نے مجھ جیسے ماڑے بندے کا انتخاب کیوں کیا۔ لیکن

آہستہ آہستہ مجھ پہ ان کی شخصیت کے سارے پرت کھلنے لگے۔۔۔ ہر بات واضح ہونے لگی۔

چند ہی مہینوں میں میں جان گیا کہ کریم بخش کا اپنے لیے ایک مسکین سا داماد ڈھونڈنے کے پیچھے کون سے تحفظات کار فرما تھے۔

کریم بخش ایک انتہائی خود پسند شخص تھا۔ سونے پہ سہاگہ سیلف میڈ بھی۔۔۔ اور سیلف میڈ لوگ ویسے بھی عمر بھر اپنی جدوجہد اور کامیابیوں کے گن گاتے اور ان پہ اتراتے نہیں تھکتے۔ انہوں نے کسی زمانے میں خاصا برا وقت بھی دیکھا تھا اور مجھ سے زیادہ اچھی طرح کون یہ جان سکتا ہے کہ برے وقت میں رشتے دار کیسے بے موسمی پھل کی طرح غائب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا رشتے داروں سے الرجک رہنا آسانی سے سمجھ میں آتا تھا۔

انہیں یہی خطرہ رہتا تھا کہ کسی کے قریب ہوئے تو وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں میں اور جھوٹی محبت اور اخلاص میں پھنسا کے اپنا الو سیدھا کر لے گا۔ ان کی اس احتیاط کا خاصا اثر ہنزہ نے لیا۔ اسے بچپن سے ہی الگ تھلگ رہنے کی عادت ڈالی گئی۔ ایسے بچوں کی اکثریت رفتہ رفتہ خود ہی آدم بیزار اور تنہائی پسند ہو جاتی ہے لیکن ہنزہ فطرتاً" محبت کرنے والی اور معصوم تھی۔ اسے اپنی محبت لٹانے کے لیے آس پاس کوئی نہ ملا اور وہ اسے سینت سینت کر رکھتی گئی۔۔۔ (اب میں موجاں کر رہا تھا) ماں کی محرومی نے اسے باپ سے قریب ضرور کیا مگر اس کی عادت و خصلت کے وہ آس پاس بھی نہ پھٹکی۔ یوں دیکھا جائے تو مجھ جیسا خوش قسمت اور کوئی نہیں تھا۔

میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔۔۔ سوچا تھا کتنی بے عزتی ہو جائے گی؟ زیادہ سے زیادہ۔۔۔ اپنے ہی گھر میں۔۔۔ اپنے ہی حق کا کھاتے ہوئے پھوپھو جیسی عورت کا گھر داماد کہلانے اور سجاد جیسے ہتھ چھٹ کا "گھر بہنوئی" بننے سے بہتر تھا کہ میں وہ مکھی نگلتا جو انجانی' ان دیکھی تھی۔ لیکن یہ معجزے سے کم نہ تھا کہ ہنزہ جیسا بمپر پرائز میرے نام نکلا۔

اب میں ذرا سا۔۔۔ بلکہ اچھا خاصا ندیدہ اور ناشکرا ہو چلا تھا۔۔۔ میں جو دل میں یہ ارادہ کر کے اس شادی پہ تیار ہوا تھا کہ جو ہوا' دیکھا جائے گا۔ جیسی بھی بیوی ملی گزارہ کر کے صابر و شاکر کہلاؤں گا اور شاید اسی ایک نیکی کے بدلے جنت کا چانس بھی بناؤں گا اور صابر شاکر بننے کے سارے ارادے خواب و خیال بنتے گئے۔ ہنزہ نے مجھے اتنا سر چڑھا دیا تھا کہ کریم بخش رندھاوا سے بھی میں اسی پروٹوکول کی توقع لگانے لگا۔

لیکن وہ ایسا کیوں کرتے۔۔۔ یہ سب کرنے سے بچنے کے لیے ہی تو انہوں نے مجھ سے کم مایہ داماد کا انتخاب کیا تھا ورنہ اپنے سرکل میں انہیں ایک سے ایک شخص مل سکتا تھا مگر اپنی ٹکر کے یا اپنی حیثیت سے اوپر کا داماد لا کے وہ اپنا سر جھکانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس مفروضے کو غلط ثابت کرنے کا سوچا تھا کہ بیٹی کے باپ کا سر جھکا ہی رہتا ہے۔ بڑی پلاننگ کے ساتھ انہوں نے میرے جیسے گھر داماد کو چنا تھا۔۔۔ جس کا نہ آگا تھا نہ پیچھا۔۔۔ مگر خاندانی اور شریف تھا۔۔۔ ذات میں کوئی عیب بھی نہیں تھا۔ اچھی طرح سے ٹھونک بجا کر انہوں نے میرے سر پہ سہرا باندھا اور پھر اپنے شوق پورے کرنے لگے۔

"محمود۔۔۔"

صبح سویرے میری آنکھ ہنزہ کی چوڑیوں کی کھنک یا اس کی مدھر ہنسی سے کھلنے کے بجائے ان کی کڑک دار آواز سے کھلتی۔ انہیں انگریزوں کی طرح سیکنڈ نیم سے پکارنے کی عادت تھی یا انہیں قیصر نام پسند نہیں تھا یہ میں سمجھ نہیں پایا مگر ہر بار ان کے منہ سے اتنے تحکم بھرے انداز میں یہ نام سن کر میں بے بسی سے پھڑپھڑا کے ضرور رہ جاتا کیونکہ ظاہر ہے یہ میرے ابا جی کا نام ہے اور اس کے یوں پکارے جانے پہ میرا ناراض ہونا میرا حق بھی ہے۔۔۔ لیکن چاہنے کے باوجود میں اب تک یہ حق استعمال نہ کر پایا تھا۔

"ساڑھے سات ہو گئے ہیں۔ تم اب تک سو رہے ہو؟"

دروازے کے پار سے ان کی آواز آتی جیسے ساڑھے

سات نہیں، ساڑھے بارہ بج چکے ہوں۔
"جلدی باہر آؤ..... میں جم میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
بیسمنٹ میں انہوں نے ذاتی جم بنا رکھا تھا۔ اور میری صحت کے بارے میں مکمل طور پہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد ہی مجھے داماد بنانے والے رندھاوا صاحب کو اب پتہ نہیں کیوں میری فٹ نیس مشکوک لگنے لگی تھی۔
"نائنٹی فور..... نائنٹی فائیو۔"
مجھے شرمندہ کرنے کے لیے ہی وہ اتنی اونچی آواز میں گن رہے تھے میں نے بھی ویٹ اٹھاتے ہوئے ڈھیٹ بن کر زیر لب دہرایا۔
"ٹوئنٹی ون..... ٹوئنٹی ٹو۔"
"تمہارا تو حساب بھی خاصا کمزور ہے، ابھی بارہ تک پہنچے ہو اور بائیس گن رہے ہو۔"
"بھئی بڑی تیز نظر ہے۔" میں بڑبڑایا۔
"تمہارا سانس بہت جلدی پھول جاتا ہے سگریٹ پینے لگے ہو؟"
"جج..... جی نہیں، نہیں تو۔" سچا ہونے کے باوجود میں لڑکھڑا جاتا جس پہ وہ اور زور سے ہنکارا بھرتے۔
"جھوٹ بولنے والے سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"آپ کو کس سے نفرت نہیں ہے؟" میرا دل کراہ اٹھا۔
"میں نے اپنی بیٹی کی شادی اس لیے نہیں کی کہ اس کا شوہر سگریٹ پھونکنے کے بعد نہ صرف خود کوئی بی دے اور پھیپھڑوں کے کینسر کی جانب پیش کردے بلکہ اسے بھی ایک غیر صحت مندانہ ماحول دے۔ اس کے سامنے بھی پیتے ہو سگریٹ؟"
"میں سگریٹ نہیں پیتا خدا کی قسم!" میں روہانسا ہو گیا۔
"قسم جھوٹے کھاتے ہیں۔" انہوں نے بھی شاید قسم کھا رکھی تھی مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی۔
"وہ ایکچوئلی..... " میں پھر سے ہکلایا۔
"سگریٹ تو نہیں البتہ وہ کل میں نے یونہی بس ذرا سا شیشہ پیا تھا۔"
"شیشہ؟" ان کے ہاتھ سے ڈمبل چھوٹ کر نیچے جا گرے۔
"شیشہ پیا تھا؟ شیشہ بھی پینے کی چیز ہے بھلا؟ وہ تو دیکھنے کی چیز ہے بے وقوف انسان۔"
میں نے کسی انسان کو اتنی جلدی کسی دوسرے سے بے تکلفی کی تمام حدیں پار کرتے نہیں دیکھا جتنی جلدی میرے سسر صاحب نے دکھائی تھی، آپ سے تم پہ..... اور برخوردار سے بے وقوف انسان پہ آنے میں۔
"پیا بھی جاتا ہے۔" میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا اور ان کا تجسس دور کرنے کی خاطر انہیں نزدیکی کیفے میں لے جا کر دکھلایا بھی۔
"اچھا..... حقہ۔" انہوں نے اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے مجھے دیکھا اور پھر ایکا ایکی ان کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔
"تم حقہ پیتے ہو! تمہیں اپنے نہیں تو ہمارے اسٹیٹس کا تو خیال رکھنا چاہیے۔"
"شیشہ آج اسٹیٹس سمبل بن چکا ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔
"واٹ ربش..... میں نے تو کبھی اپنے مالی کو حقہ پینے کی اجازت نہیں دی۔ تمہیں کیسے دے سکتا ہوں۔ آج کے بعد تم مجھے ایسی کسی نامعقول لت میں گرفتار نظر نہ آنا۔" وہ بڑی کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔
"چلیں اب؟" میں نے مزید تفتیش سے بچنے کے لیے کہا۔
"ہاں تم چلو..... میں آتا ہوں..... ایک کام ہے۔" انہوں نے مجھے بھیج کے ڈرائیور کو ایک گھنٹے بعد آنے کا کہا۔

☆ ☆ ☆

"ہنزہ! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہیں دور چلا جاؤں

—— یہاں سے بہت دور کسی ویرانے میں۔"
یہ کہنے کے بعد میں نے اس کے چہرے پہ ردِ عمل تلاشنا چاہا۔ وہاں وحشت سی اتر آئی تھی۔۔۔ آنکھیں پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب تھیں۔ ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔
میں بری طرح گھبرا گیا۔
"یا اللہ خیر۔۔۔! میں نے کوئی غلط اطلاع تو نہیں دے دی؟ نہیں نہیں میں نے تو خاصے محبت بھرے لہجے میں یہ رومانٹک جملہ کہا ہے۔
محبت بھرا لہجہ تو یاد تھا' الفاظ نئے سرے سے یاد کرنے کے لیے میں نے اپنا ہی کہا فقرہ ذہن میں دہرایا۔
"دھت تیرے کی۔۔۔" کہیں دور چلا جاؤں کے ساتھ میں "تمہارے ساتھ" کا اضافہ کرنا تو بھول ہی گیا۔

"مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی ہے قیصر۔۔۔! میں نے کیا کوتاہی کی ہے جو آپ مجھے یہ سزا دینا چاہتے ہیں؟"
"اوہو۔۔۔ میں تو۔۔۔"
"کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا آپ کے دل میں ذرا سی بھی جگہ نہیں بنا پائی میں۔ جو آپ مجھ سے دور جانا چاہتے ہیں۔"
"میرا مطلب تھا' تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں یہاں سے بہت دور کسی ویران سی خوب صورت جگہ پہ۔"
"ویران جگہ خوب صورت نہیں ہوتی۔"
"مگر خوب صورت جگہ ویران ضرور ہو سکتی ہے۔ اگر لوگوں کو اس کی خوب صورتی کے بارے میں پتہ نہ ہو اور وہ وہاں نہ آتے ہوں۔"
"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔
"چلیں پھر؟"
"آپ سیکنڈ ہنی مون پہ جانا چاہتے ہیں۔" وہ شرمائی۔
"نہیں کیونکہ ہنی مون زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا ہو گا جبکہ میں ساری عمر کے لیے یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ دل اوب گیا ہے میرا اس شہر سے۔"
"ہمیشہ کے لیے؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بری طرح بدک اٹھی۔
"یہاں پاپا اکیلے رہ جائیں گے۔"
"ساری دنیا کی لڑکیوں کے باپ ایک نہ ایک دن اکیلے رہ جاتے ہیں۔"
"ہاں مگر میرے پاپا۔۔۔ ساری دنیا میں صرف ایک ہیں ورنہ وہ بھی مجھے رخصت کر کے اکیلے رہ رہے ہوتے اور شادی سے پہلے ہی آپ کو پتہ تھا کہ آپ کو یہیں رہنا ہو گا۔۔۔ پاپا کے ساتھ۔۔۔ پھر اب کیا ہوا ہے؟"
"مجھے صرف یہ کہا گیا تھا کہ مجھے اس گھر میں تمہارے پاپا کے ساتھ رہنا ہے؟ یہ نہیں پتہ تھا کہ چوبیس گھنٹے رہنا ہے۔" میں بڑبڑایا۔
میں نے اس کے بعد خاصی کوشش کی کہ کسی طرح وہ مان جائے میرے ساتھ یہاں سے نکلنے کو۔ میں اس کے کاندھے پہ رکھ کے بندوق چلانا چاہتا تھا کہ اگر بیٹی خود باغی ہو کر اس قید سے نکلنا چاہے تو کیا کریں گے رندھاوا صاحب مکھنزہ۔۔۔ اس ایک معاملے میں اس کی ساری تابعداریاں ہوا ہو گئیں۔
نہ میں لالچی تھا۔۔۔ نہ حریص نہ سہل پسند کہ رندھاوا صاحب کی دولت کا دربان بن کے بیٹھا رہتا اور یہ ساری ذلت سہتا رہتا۔ میں نے جس وقت ہنزہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا' تب حالات سراسر دوسرے تھے۔ میں ایک نازک جذباتی دور سے گزر رہا تھا مجھے صرف معاشی سہارا نہیں بلکہ جذباتی سہارا بھی چاہیے تھا اس لیے بلا سوچے سمجھے یہ جوا کھیل بیٹھا۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اس دھچکے سے سنبھل چکا تھا جو پھوپھو کے مجھے گھر سے نکل دینے پہ لگا تھا۔ اب چاہتا تو آسانی سے یہ سب چھوڑ چھاڑ کے آزاد اور خود مختار زندگی بسر کرتا۔
کسی من موجی کی طرح۔
جہاں کوئی صبح سویرے دروازہ کھٹکھٹا کے کڑک دار آواز میں جگا کر جاگنگ کرنے نہ لے کر جاتا۔۔۔ جہاں

کوئی میرا منہ سونگھ کر یہ سراغ لگانے کی کوشش نہ کرتا کہ میں نے سگریٹ پی ہے یا نہیں اور جو بے تکلفی سے کھانے کی ٹیبل پہ میرے سامنے سے وہ پلیٹ نہ اٹھالیتا جسے میں نے اپنی پسند کے کھانے سے بھرا ہوتا اور میرے آگے سلاد کا باؤل کر دیتا تاکہ میں ہائی کولیسٹرول کھانے کھا کے بلڈ پریشر اور ہارٹ پیشنٹ نہ بن جاؤں اور ان کی بیٹی کا سہاگ سلامت رہے۔

لیکن میں یہ کر نہیں سکتا تھا۔۔۔ دل میں آزادی کی طلب اپنی جگہ۔ مگر جو جگہ ہنزہ کی محبت نے بنالی تھی' اس کا نعم البدل کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

میرا دل اس کا اسیر ہو چکا تھا۔۔۔ میں اس کے بغیر جینے کا اب تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

کریم بخش رندھاوا جتنا مجھے دبانے کی کوشش کرتے تھے اتنا ہی میرے اندر ان سے چھپ کر سرکشی دکھانے کا جنون بڑھ جاتا تھا۔ اسی لیے میں جس کیفے میں دوستوں کے ساتھ یونہی شغل میلے میں شیشہ پینے چلا گیا تھا' وہاں اب باقاعدگی سے جانے لگا۔ حالانکہ ذرا پسند نہیں تھی مجھے اس کی شوں شوں اور غرغر۔

اس دن بھی میں اپنے ایک نئے دوست جاوید سے ملنے کے لیے اسی کیفے میں آیا۔

"کیا پیو گے؟"

"زہر۔۔۔" دل سخت جلا ہوا تھا۔ صبح صبح سسر صاحب نے ناشتے کی ٹیبل پہ جھاڑ کے رکھ دیا تھا۔۔۔ سسر سے ڈانٹ کھانا ایک تو ویسے ہی شرمندگی کی بات ہے۔ اوپر سے نئی نویلی بیوی کے سامنے ایسی عزت افزائی شدید شرمندگی۔۔۔

"وہ تو گھر پہ پیتے رہتے ہو گے کوئی نئی چیز لو۔"

جاوید کچھ کچھ میری حالت سے واقف تھا اس لیے ہنس کر طنز کر گیا۔

"یار! منگولو کچھ بھی۔۔۔ میرا تو۔"

بات کرتے کرتے میری نظر دائیں جانب گئی جہاں کریم بخش رندھاوا صاحب اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ بیٹھے شیشہ سے شغل فرما رہے تھے۔ میں بری طرح چونک گیا۔

"ایپل سوڈا چلے گا؟"

"ہاں۔۔۔ چلتا ہوں۔" بوکھلائے ہوئے انداز میں میں کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہارے نہیں' ایپل سوڈا کے چلنے کی بات کر رہا ہوں۔"

"چلتا ہوا ایپل سوڈا؟" میری نظریں' دل و دماغ سب ان پہ فوکس تھا' جاوید کی بات خاک سمجھ آتی۔

"مجھے تو لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

میں اس کے بڑبڑانے کی پروا کیے بغیر وہاں سے نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

اسے کہتے ہیں قول و فعل کا تضاد۔۔۔

یا شاید باتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔۔۔ کور شیشہ پینے کے اور۔۔۔

میں گھر آ کے بھی اسی ادھیڑبن کا شکار رہا۔

"قیصر۔۔۔ یہ دیکھیے۔" ہنزہ کی آواز پہ میں تیزی سے کمرے کی جانب لپکا۔ سوچا اسے اس کے والد گرامی کے کرتوتوں سے آگاہ کیا جائے۔ جس رندھاوا کا خون خشک کیے رکھتے ہیں' وہی رندھاوا تمیں دو سب کرتا دیکھ کر آیا ہے۔ جس سے وہ اسے ہزار بار کے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں (صد شکر کہ یہ ہزار ذہنی گفتگو یا نگاہوں کی زبان تک محدود تھے)

"تمہیں پتہ ہے ہنزہ آج میں نے کیا دیکھا؟"

"آپ نے یہ دیکھا۔" اس نے ساڑھی کا آنچل ایک ناز سے چٹکی میں پکڑ کے پھیلایا اور ایڑی کے بل گھومی۔ میرے ذہن سے تمام سازش فرار ہونے لگی۔

"ہاں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔"

"میری مما کی ساڑھی ہے۔۔۔ ان کی تصویر دکھائی تھی ناں آپ کو' وہی ان کی ویڈنگ اینی ورسری والی جو

دونوں نے آخری بار ساتھ منائی تھی' اس تصویر میں وہ یہی پہنے ہوئے تھیں۔" وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بتارہی تھی۔

"پاپا کو ماما اس ساڑھی میں..... بلکہ ہر ساڑھی میں بہت پسند تھیں۔ نانو بتاتی ہیں ماما کو پاپا سفاری سوٹ میں زیادہ اچھے لگتے تھے تو جب کبھی ماما ساڑھی پہنتیں ..... پاپا ضرور اپنا سفاری سوٹ نکالتے اور دونوں ایک دوسرے کے پسندیدہ لباس میں سمندر پہ گھومنے جاتے۔"

میں مسکرادیا..... گویا سسر صاحب میں کسی زمانے میں زندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔

"قیصر آپ بھی سفاری سوٹ پہنئے ناں۔

"میرے پاس نہیں ہے شاید۔"

"تو پرابلم..... پاپا کا پہن لیں۔"

"مروانا ہے کیا؟" میں بدک گیا۔

"میں ان کا سوٹ پہن لوں اور وہ میرا قدرتی سوٹ یعنی میری کھال کھنچوادیں۔ بہت اچھے۔" میں نے ٹال دیا مگر کچھ دیر بعد ہی وہ ایک لائٹ براؤن سفاری سوٹ ہینگر میں لیے چلی آئی۔

"آپ کو یاد نہیں۔ شادی کے گفٹس میں یہ سوٹ بھی تو تھا۔ جلدی سے پہن کر آئیں..... پلیز۔"

اس نے اتنے پیار سے کہا کہ وہ مجھے بندریا کا گھاگھرا پہننے کو بھی دیتی تو میں پہن آتا۔

"چلیں۔" مجھے محسوس ہوا کہ اپنے باپ کی طرح وہ بھی مجھ سے کوئی بات منوا کے' اپنی چلا کے بہت خوش ہوا کرتی تھی مگر کریم صاحب کی خوشی کے پیچھے ان کے جذبہ حاکمیت کی تسکین ہوتی تھی جب کہ ہنزہ کی خوشی سوائے اس محبت کے اور کچھ نہیں تھی جو اپنی عزیز ہستی کو اپنی دیرینہ خواہش پوری کرتے دیکھ کر امنڈ آتی ہے۔ اس لیے اس کی بات مانتے ہوئے مجھے اچھا بھی لگتا تھا۔

"پاپا..... یہاں دیکھیں۔"

سٹنگ روم میں میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ کر لے جانے کے بعد وہ کریم بخش رندھاوا صاحب کے سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے بی بی سی نیوز سے نظریں ہٹا کے اس مسکراہٹ کے ساتھ ہنزہ کی جانب دیکھا جو شاذونادر ہی ان کے سنگلاخ ہونٹوں کو رونق بخشتی تھی۔ مگر ہنزہ کے بعد مجھ پہ..... میرے بعد ہنزہ پہ نظر ڈالتے ہی ان کی یہ مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"پاپا دیکھیں ناں' ہم بالکل آپ جیسے لگ رہے ہیں ناں؟" وہ اپنی دھن میں کہتی جارہی تھی۔

"آپ کے اور ماما کے جیسے۔"

"یہ کیا مذاق ہے ہنزہ!" ان کے ہونٹوں سے سرسراہٹ نکلی۔ تب پہلی بار..... جی ہاں پہلی بار میں نے کسی پتھر کو گیلا ہوتے دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

وہ تیزی سے مڑے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ہنزہ ہکا بکا رہ گئی۔

"قیصر..... کچھ غلط ہوگیا کیا؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں اپنا حساب کتاب جوڑنے میں مصروف تھا۔

"شاید پاپا مائنڈ کر گئے..... میں چینج کر کے آتی ہوں۔"

وہ تو فوراً" ساڑھی تبدیل کرنے اندر چلی گئی اور میں سوچتا رہا۔ میں نے پتھر پہ قطرے گرتے دیکھے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اگر ایک تواتر سے برسیں تو قطرے بھی پتھر میں شگاف ڈال سکتے ہیں۔

اور تب میں نے اخبار میں..... اخبار میں وہ اشتہار دیا جہاں سے کہانی میں ٹوئسٹ آیا۔

یا شاید ٹوئسٹ آنے کے بعد اشتہار دیا۔ اس کا فیصلہ شاید آپ اس اشتہار کے عکس پہ نظر ڈالنے کے بعد کر سکیں گے۔

"ہمارے پاپا کریم بخش رندھاوا اور ماما نرگس کریم کی شادی کی اٹھائیسویں سالگرہ مورخہ 31 دسمبر کو بمقام ان کی رہائش گاہ پہ منعقد کی جارہی ہے۔ تمام ملنے جلنے والوں اور دوستوں عزیزوں سے شرکت فرمانے کی درخواست کی جاتی ہے۔

منجانب

قیصر محمود، ہنزہ محمود

☆ ☆ ☆

یہ اپنی نوعیت کا نرالا اشتہار تھا جو اخبار میں شائع ہوا تھا۔ ورنہ عموماً "وفات، قل، چالیسویں، برسی وغیرہ کے اشتہار شائع ہوا کرتے تھے۔ اپنی دوسری اور برتھ ڈے جیسے ایونٹس کے لیے تو انفرادی طور پہ دعوت نامے بھجوائے جاتے ہیں۔ وہ بھی بھجوائے گئے تھے مگر یہ اہتمام دراصل تمام خاص و عام کو مطلع کرنے کے لیے تھا کہ کریم بخش رندھاوا اور ان کی بیگم نرگس کریم کے مابین پچھلے ۔ سالوں سے جو تنازعہ چل رہا تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔

ہنزہ چار برس کی تھی جب اس کے ماما پاپا میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ وجہ دونوں کا مختلف بیک گراونڈ سے ہونا تھا۔ کریم بخش، نرگس کے یعنی میرے ساس کے والد کے ہاں اکاؤنٹنٹ تھے۔ دونوں محبت کا شکار ہوئے ..... نتیجہ شادی کی صورت میں نکلا مگر بے پناہ مخالفت کے سائے میں کریم صاحب کو اپنی عزت اور خودداری بے حد عزیز تھی اور ہنزہ کے نانا کو اپنی ناز و نعم میں پلی بیٹی۔

ہٹ دھرم اور ضدی تو کریم صاحب سدا کے تھے۔ اپنی منوا کے رہے اور بجائے خود بیوی کے ہاں رہنے کے، اسے ہی اپنے چار مرلے کے ایک بیڈ روم والے فلیٹ میں رخصت کرا کے لے گئے۔ انہوں نے شادی کے بعد سسر کی فرم میں ملازمت بھی چھوڑ دی مگر جلد ہی ایک دوسری کمپنی میں انہیں ان کی قابلیت اور تجربے کی بنا پہ تین چار گنا زیادہ اچھی جاب مل گئی۔ اگلے ہی سال ترقی ..... اس سے اگلے سال مزید ترقی۔

وہ اس چار مرلے کے فلیٹ سے تین بیڈ روم والے فلیٹ میں منتقل ہوئے جلد ہی خود بھی دو سے تین ہو گئے۔ موٹر سائیکل سے کار تک کا سفر بھی طے کر لیا۔ کریم صاحب اسے اپنی شریک حیات کے قدموں کی برکت کہا کرتے تھے۔ یقیناً" ان کا ساتھ ان کے لیے بھاگوان ثابت ہوا تھا لیکن جلد ہی یہ حقیقت بھی کھل گئی۔

ان سب ترقیوں کے پیچھے کریم صاحب کے سسر کا ہاتھ تھا۔ وہی تھے جنہوں نے اپنے دوست کی کمپنی میں نہ صرف ان کو ایک اچھی پوسٹ دلوائی تھی بلکہ تنخواہ میں مسلسل اضافے بھی کرواتے رہے تھے۔ یہ حقیقت سامنے آنے پہ کریم صاحب بپھرے ..... مگر تب تو ٹوٹ کے رہ گئے جب یہ پتہ چلا کہ اس سازش میں ان کی شریک حیات بھی اپنے والد کے ساتھ شامل تھیں۔

انہوں نے صفائی دینے کی بہتیری کوشش کی ..... بہت سمجھانا چاہا کہ ایسا کرنے کے پیچھے ان کی کیا نیت کارفرما رہی مگر کریم صاحب مان کے نہ دیے۔ اور اپنی ہی محبت کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹتے ہوئے انہیں اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔

اس کے بعد وہ تھے اور ہنزہ چار سال کی ہنزہ


عیدالاضحیٰ کا تحفہ

کھانا خزانہ

سنجیو کپور، کا نیا ایڈیشن

جس میں گوشت کے پکوانوں

کی 25 لذیذ ترکیبیں

20 خوبصورت رنگین تصاویر

نئے ایڈیشن میں -/25 روپے کی خصوصی رعایت

نئی قیمت -/225 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

آج ہی منی آڈر یا ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔

منگوانے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی۔

فون: 2216361

ـــ جسے اس کی ماما لے جانا چاہتیں تو لے جا سکتی تھیں مگر صرف کریم صاحب کی تنہائی کے خیال سے نہ لے کر گئیں کہ یہ شخص جو سخت بے اعتبار ہو رہا ہے محبت سے ـــ مگر رہا ہے رشتوں سے شاید بیٹی کا ساتھ اسے موم کرتا رہے۔ پتھر ہونے سے بچالے۔ یہ ان کی محبت کی انتہا تھی کہ انہوں نے اپنی ممتا کا گلا گھونٹ دیا۔ سینے پہ پتھر رکھ لیا مگر کریم صاحب کی زندگی کو بے رنگ کر دینے کی ہمت نہ کر پائیں۔

اس کے بعد کریم صاحب نے جو بھی ترقیاں کی وہ ان کے اپنے بل بوتے پہ تھیں ـــ شاید یہ اس ہتک کا ازالہ کرنے کے لیے تھی جو انہوں نے یہ جان کے سہی تھی کہ اب تک وہ کسی اور کے کاندھوں کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ اس پانے اور بہت کچھ پانے کے چکر میں وہ بنتے چلے گئے۔ ہر احساس ـــ ہر دکھ' ہر درد' ہر کسک سے عاری ایک مشین۔

دانستہ کا دانستہ انہوں نے ہنزہ کے لیے وہی فیصلہ کیا جو ان کے سسر نے ان کے لیے کرنا چاہا تھا اور وہ رسّی تڑا کے بھاگ نکلے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو یہ تجزیہ کر پاتا ہوں کہ ان کے اس عمل سے ایک ہارمانے کا احساس ظاہر تھا۔ جیسے انہوں نے ایک باپ کے طور پر اپنے سسر کے باپ ہونے کے جذبات کو جان لیا ہو۔ وہ بھی اکلوتی بیٹی کے باپ تھے۔ انہیں بھی بیٹی کے تحفظات عزیز تھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کریم صاحب کو تھے۔

رہا میرے ساتھ ان کا رویہ تو شاید وہ مجھے اپنی جگہ دیکھتے تھے اور خود کو سزا دینے کی نیت سے میرے ساتھ یہ سب کرتے تھے۔

اس دن مجھے اور ہنزہ کو دیکھ کے ان کی آنکھوں میں یکایک اس بچھڑے ساتھ کی یاد ہلکورے لینے لگی تھی۔

لوہا گرم تھا ـــ ایسے میں ضرب لگتی تو گھاؤ کا سودا نہ ہوتا اس لیے میں نے ہنزہ کی ماما کا پتہ لگایا اور ہنزہ کے ساتھ وہاں جا پہنچا۔ وہ میری اور ہنزہ کی شادی سے واقف تھیں۔ وہاں جا کے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ داماد ہونا کسے کہتے ہیں ـــ سسرال سے ملنے والا پروٹوکول کیا ہوتا ہے۔ سب نے وہاں مجھے سر آنکھوں پہ ہی بٹھایا اور جب میں نے ماما کو کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ یہ بتایا کہ ان کے جانے کے بعد کریم صاحب کس طرح نفسیاتی و جذباتی طور پہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور ان محرومیوں کا بدلہ وہ ہماری شادی شدہ زندگی سے لے رہے ہیں تو وہ بھی اپنی ضد اور انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئیں۔

الگ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی جانب سے کافی عرصہ تک کریم صاحب کو رام کرنے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ صفر نکلا ـــ وہ ان کی خطا بخشنے پہ تیار نہیں تھے تو پھر وہ بھی اڑ گئیں ـــ ساس سے اب دونوں کے درمیان برائے نام رابطہ بھی نہیں تھا لیکن صرف بیٹی کی گھر بستی بچانے کے لیے اور گھر آئے داماد کا مان رکھنے کے لیے انہوں نے ایک بار پھر پہل کی اور وہاں تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ پہلے سے لوہا گرم تھا۔ وہ پگھل گئے۔

☆ ☆ ☆

صرف عورتیں ہی اپنی ساسوں سے نالاں نہیں ہوتیں۔ مرد بھی اس رشتے سے خار کھاتے ہیں۔ مردوں نے اپنی ساسوں کے بارے میں بڑے لطیفے مشہور کر رکھے ہیں مگر میری ساس میرے لیے سچ مچ کی خوش دامن ثابت ہوئیں کیونکہ وہ میرے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر گئیں۔

بیس سالوں کی جدائی کے بعد ملے اور روز و شب کی مداخلت برداشت نہیں تھی ـــ بیٹی اور داماد کی بھی نہیں اس لیے ہمیں دوسرے بنگلے میں جانے کی بخوشی اجازت دے دی گئی۔

اب میں ہر سانس کے ساتھ اپنی خوش دامن کے لیے دعائیں مانگنے والا دنیا کا واحد داماد کہلاتا ہوں۔